استفسارات

احمد جاوید

استفسار:

میں اقبال کی شہرہ آفاق نظم ''مسجد قرطبہ'' کو ایک عظیم نظم سمجھتا ہوں اور اُس کا عاشق اور حافظ ہوں۔ البتہ تصوف کا علمی پس منظر رکھنے کی وجہ سے اس کے ابتدائی تین اشعار میرے لیے کچھ الجھن پیدا کر دیتے ہیں۔ جتنا غور کرتا ہوں اُتنا ہی یہ خیال مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے کہ ذات الٰہیہ اور زمانے کے تعلق کا یہ بیان مذہبی ذہن اور صوفیانہ ذوق کے لیے یا تو ناقابل فہم ہے یا ناقابل قبول۔ یوں لگتا ہے کہ ان اشعار میں ذاتِ حق کی حقیقی شان کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور اُس میں زمانیت کا عنصر داخل کر دیا گیا ہے۔ میرا یہ احساس یقیناً غلط ہوگا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھ پر اپنی غلطی ابھی واضح نہیں ہے۔ یہ واضح ہو جائے تو میں اپنی اصلاح کرلوں۔ آپ کو اسی لیے زحمت دے رہا ہوں۔

[سجاد معین الدین]

جواب:

آپ اگر وضاحت سے بتا دیتے کہ ان اشعار میں فرداً فرداً آپ کو کیا مشکلات پیش آ رہی ہیں تو جواب دینے میں زیادہ آسانی ہو جاتی۔ شاید آپ کے اشکالات یہ ہیں کہ:

۱۔ زمانے کو ''نقش گرِ حادثات'' کیوں کہا گیا ہے؟

۲۔ اسے ''اصلِ حیات وممات'' قرار دینے کا کیا مطلب ہے؟

۳۔ زمانے کو یہ حیثیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے ذاتِ الٰہیہ اپنی ''قبائے صفات'' بناتی ہے؟

۴۔ ''سلسلۂ روز وشب'' کو ''سازِ ازل کی فغاں'' کہہ کر اُسے یہ مرتبہ کیسے دیا گیا کہ اس کے ذریعے سے ذاتِ حق ''زیر و بم ممکنات'' دکھاتی ہے؟

اگر میں ٹھیک سمجھا ہوں تو ان مشکلات کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے:

۱۔ ''حادثات'' کو چاہے واقعات کے معانی میں لیں، خواہ عارضی وجود رکھنے والی چیزیں سمجھیں، زمانہ

ان دونوں کا نقش گر ہے۔ یہ بات ہر لحاظ سے درست ہے۔ کسی خیال کے صحیح یا غلط ہونے کے تمام معیارات پر یہ تصور یکسر درست ہے کہ حدوث کا مادہ اور اس کے تمام مظاہر وقت کی اصل پر قائم اور اس کے دائرے میں محصور ہیں۔ زمانہ نہ ہوتا تو ہستی کا یہ اصول ناپید رہ جاتا۔ یہ وقت ہی ہے جو اس اصول اور اس کی تمام صورتوں کی پیدائش اور اظہار کا سبب ہے۔ ہستی اور تاریخ کا پورا خاکا اسی کے ہاتھوں بنتا اور بگڑتا ہے۔ اگر کسی ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ یہ تو ایک خدائی وصف ہے، اسے زمانے سے کیونکر منسوب کیا جا سکتا ہے! تو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ ایک مصنوعی شبہ ہے جو اپنا کوئی جواز نہیں رکھتا۔ کسی وصف کے حدودِ معنی اور معنویت کا انحصار ہمیشہ اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کا موصوف کون ہے۔ موصوف بدل جائے تو ایک ہی وصف کا مطلب اور مرتبہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ شعر کے الفاظ ہی سے واضح ہے کہ ''نقش گر'' کو اسی مفہوم میں لیا جائے گا جو وقت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ یہ نہ کیا جائے تو لفظ و معنی کی کوئی بھی نسبت برقرار نہیں رہ سکتی اور انسانی اوصاف کا ہر ادراک و اظہار ممنوع ہو کر رہ جائے گا۔

۲۔ زمانہ ''اصلِ حیات و ممات'' ہے——اس بات کو بھی اوپر بیان ہونے والے استدلال کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔ انسان کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایک زمانی وجود ہے، اس کی زندگی بھی وقت کی پابند ہے اور موت بھی۔ ان معنوں میں وقت حیات و ممات کی اصل ہے۔ اسی بات کو اور بڑھا کر کہیں تو مخلوق میں موت و حیات کا پورا نظام وقت کی اصل پر چل رہا ہے، وقت نہ ہو تو مرگ و زیست کا پایا جانا تو دور کی بات ہے ان کے تصور کی تشکیل بھی محال ہو جائے۔ کسی شے کی اصل کا اس کے علاوہ کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ وہ شے اس اصل سے جُدا ہو کر نہ وجود پا سکتی ہے نہ تصور کی جا سکتی ہے۔ باقی یہ کہنا کہ ''اصل حیات و ممات'' امرِ ربی ہے، یہاں ایک خلط مبحث سے زیادہ کچھ نہیں، کیونکہ زمانے کو اس مفہوم میں اصل نہیں کہا جا رہا جس مفہوم میں امر ربی کا اصلِ کل ہونا ثابت ہے۔ وہ علت فاعلہ ہے جبکہ وقت کی حیثیت اس سبب کی سی ہے جو خود اپنے لیے بھی کسی بنیاد اور محرّک کا محتاج ہے۔

۳۔ ''قبائے صفات'' کا مطلب ہے آثارِ صفات جو ذات کو ظاہر بھی کرتے ہیں اور مخفی بھی رکھتے ہیں۔ کائنات میں اللہ کا ظہور اس کی مختلف صفات کے حوالے سے ہے اور اس ظہور کے سلسلے کو متحرک رکھنے کے لیے اللہ نے زمانے کو پیدا فرمایا ہے۔ صرف یہی نہیں، صفات کی کثرت کا اظہار اگر زمانہ ایجاد نہ ہوا ہوتا تو محال تھا۔ لیکن چونکہ یہ کثرت غیر متعلق اور منتشر اکائیوں کا انبار نہیں ہے بلکہ ہر صفت اپنے ظہور میں دیگر صفات سے جڑی ہوئی ہے لہٰذا آثارِ صفات کی اسی باہم پیوستگی کو اقبال نے

''قبائے صفات'' سے تعبیر کیا ہے ـــــ یعنی صفات الٰہیہ اور ان کے انفسی و آفاقی مظاہر کثیر ہیں اور ایک دوسرے سے مل کر ذاتِ الٰہیہ کی طرف ایسا اشارہ کر رہے ہیں جن سے اس کا الظاہر ہونا لائق ادراک ہو جاتا ہے اور الباطن ہونا قابل اثبات۔ غور سے دیکھیں ''قبا'' کے لفظ میں یہ دلالت موجود ہے کہ صفات ذات کو ظاہر بھی کرتی ہیں اور چھپائے ہوئے بھی ہوتی ہیں۔ بہر کیف یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے کائنات اپنے ظہور کے لیے تخلیق کی اور چونکہ کائنات زمانیت کی اصل پر خلق ہوئی ہے لہٰذا اس میں برپا ظہور کا سارا سلسلہ بھی ایک زمانی رنگ اور آہنگ رکھتا ہے، اور ظہور کی غایت یعنی معرفتِ حق جس شعور کا موضوع ہے خود وہ شعور زمانیت کے قوام سے بنایا گیا ہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ ظہور بھی زمانے میں ہے اور شعور بھی زمانے میں ہے، تو اس صورتِ حال میں وقت کو قماشِ ظہور کا تانا بانا قرار دینا حسنِ اظہار اور کمال ادراک کی بات ہے، اس کی تحسین ہونی چاہیے اسے اشکال کا سبب نہیں بننے دینا چاہیے۔

۴۔ ''سلسلۂ روز و شب'' کو ''سازِ ازل کی فغاں'' کہہ کر اقبال نے گویا زمانے کی حقیقت کو مجسم کر دیا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی بڑے سے بڑے شاعر نے بھی وقت کے لیے ایسی مکمل تشبیہ اختراع کی ہو جو ایک طرف تو عارفانہ منتہا کو چھو رہی ہے اور دوسری جانب جمالیاتی شعور کی رسائی کی آخری حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ زمانہ پہلی حرکتِ کونی کا نام ہے جو وجود کو اس کی اصل سے دور لے جا رہی ہے۔ اقبال کے ذوق کے مطابق اس بات کو یوں کہنا چاہیے کہ مخلوقات کے وجود کو اپنے قیام اور تکمیل کے لیے جس جوہر فراق کی ضرورت ہے وہ وقت سے فراہم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ ''ممکنات'' کے بارے میں اگر ذہن صاف نہ ہو تو اس شعر کو سمجھنا مشکل ہو سکتا ہے۔ خود اقبال نے متعدد مقامات پر یہ اصطلاح چونکہ امکانات اور استعدادات کے معنی میں استعمال کی ہے لہٰذا اس بات کا پورا امکان پایا جاتا ہے کہ کوئی صاحب یہاں بھی ممکنات کو ذاتِ الٰہیہ میں پوشیدہ امکانات کے معانی میں لے لیں اور پھر یہیں رُک جائیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ خاصی مشکل پیدا ہو سکتی ہے اور شعر کا ایسا مطلب سامنے آ سکتا ہے جو بقول آپ کے، مذہبی شعور اور صوفیانہ ذوق کے لیے ناقابل فہم اور ناقابل قبول ہو۔ کیونکہ ذاتِ الٰہیہ میں امکانات کی کارفرمائی کا خفیف سے خفیف تصور بھی ذات کی ہر تعریف سے متصادم ہے۔ اگر ''ممکنات'' کو معروف معنی کے مطابق مخلوقات سمجھا جائے اور فکرِ اقبال کی رعایت سے اس میں مخلوقات کے ذاتی امکانات اور ذاتِ حق کی لامتناہی خلاّقی کو بھی شامل کر لیا جائے تو شعر کا مفہوم یہ بنے گا کہ وقت تخلیق کے سلسلے کا آغاز ہے جس کے ذریعے سے اللہ کی

شانِ خلّاقی کا مسلسل ظہور ہوتا رہتا ہے اور انسان و کائنات کے وجودی امکانات کا اظہار بھی جاری رہتا ہے۔ اس شعر میں کچھ اور معنوی کمالات و محاسن بھی ہیں لیکن ان کی نشان دہی غالباً آپ کو درکار نہیں ہے۔

❁❁❁

استفسار:

ضرب کلیم کی نظم بعنوان ''وحی'' میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی۔ بہت کوششیں کر چکا ہوں لیکن یہ تین اشعار کی نظم گرفت میں نہیں آتی۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

فکر بے نور ترا، جذبِ عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

خُوب و ناخُوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرارِ حیات

اس نظم میں سب سے زیادہ مشکل ''حیات'' کو سمجھنے میں پیش آ رہی ہے۔ مہربانی فرما کر ان اشعار کی ایسی تشریح کر دیں کہ ''حیات'' کے معانی بھی واضح ہو جائیں۔

[احمد سیف الرحمٰن]

جواب:

اگر عنوان پر غور نہ کیا جائے تو یہ نظم واقعی مشکل ہے۔ ہم عنوان ہی سے شروع کریں گے۔ اللہ نے عالم وجود کو دو اصول پر خلق فرمایا ہے ——— ایک فطرت اور دوسرا ہدایت۔ فطرت ہو یا ہدایت، دونوں کا قیام جس خدائی امر پر ہے وہ وحی ہے۔ انسان حق کے ساتھ تعلق کی ان دونوں اقلیموں کا مرکز ہے، یعنی انسان کو خدا کے ساتھ جو نسبت حاصل ہے اس میں فطرت اور ہدایت دونوں ایک ہیں اور ان کا امتیاز حقیقی نہیں ہے بلکہ لفظی۔ گویا انسان وحی کی کلیت کا مخاطب ہے اور اس کے نظامِ ہستی کو شعور اور عمل کی سطح پر جس الوہی رہنمائی کی ضرورت ہے اُس میں فطرت اور ہدایت ہم معنی ہیں، کیونکہ ان دونوں کی اساس ایک ہی امر یعنی ایک ہی وحی پر ہے ——— یہاں یہ خیال رہے کہ فطرت سے مُراد صرف خارجی فطرت نہیں ہے بلکہ اس میں انفس و آفاق دونوں شامل ہیں۔

اب نظم کے دیگر اہم الفاظ کا بھی تجزیہ کر لیتے ہیں، اُمید ہے کہ اس طرح کسی رسمی شرح کی ضرورت نہ رہے گی:

عقلِ بے مایہ: عقل کو بے مایہ اس لیے کہا ہے کہ یہ اپنا کچھ نہیں رکھتی۔ فطرت کے بارے میں اس کا سارا علم حواس کا محتاج ہے اور ہدایت کے باب میں بھی اس کی کل پونجی وہ تصورات ہیں جن کی تصدیق کا کوئی یقینی ذریعہ اسے میسر نہیں اور جن کی تغیر پذیری کی وجہ سے خود عقل ان پر اعتماد نہیں کرتی۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عقل ان حقائق سے محروم ہے جو فطرت اور ہدایت کی بنیاد ہیں۔

امامت: یعنی رہنمائی کا وہ منصب جس پر فائز ہو جانے والا فطرت کے حقائق اور ہدایت کے اصول پر پہنچا دیتا ہے اور ان دونوں کی اصلِ واحد کو دوسروں پر منکشف کروا دیتا ہے۔ امامت کا کام یہ ہے کہ انسان کو حقائق کے روبرو کر کے مستقل یقین کی جگہ پر کھڑا کر دے۔

ظن و تخمیں: گمان اور اندازہ جو عقل کا مدارِ کار ہے۔ غیب ہو یا شہود، عقل گمان اور تصور کی حد سے آگے نہیں جا سکتی۔

کارِ حیات: زندگی کا نظام جو ہدایت اور فطرت کی ہم آہنگی پر ہی چل سکتا ہے۔

فکر بے نور ترا: یقین حضور سے پیدا ہوتا ہے جو عقل کے نصیب میں نہیں ہے۔ اس لیے اس کے تدبّر اور تخیل کا ہر عمل گویا اندھیرے میں ہوتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عقل کا ہر کام اگر وحی سے بے نیاز ہو کر ہو تو وہ تاریکی کا سفر ہے۔ اس کا معلوم بھی غیر حقیقی ہے اور مجہول بھی۔

جذبِ عمل: جذبۂ عمل ——— 'جذب' یہاں جذبے کے علاوہ اس کشش کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جو بڑے مقاصد کے روبرو ہو کر انسان کے تجربے میں آتی ہے۔ مقصود کی یہی کشش عمل کی اصل محرک ہے، یہ نہ ہو تو آدمی کا ہر فعل و عمل چند عارضی ضروریات کی تکمیل تک محدود رہ جاتا ہے اور حیاتیاتی سطح سے اوپر ہو کر انسانی معیار تک نہیں پہنچتا۔ جذبِ عمل کو بے بنیاد کہہ کر اقبال یہ بتا رہے ہیں کہ 'بے مایہ عقل' پر انحصار کرنے والی شخصیت محض ذہنی خلا کی اسیر نہیں رہتی بلکہ اس کا پورا نظام العمل ہدایت اور فطرت پر مبنی مقاصد اور اقدار سے منقطع ہو جاتا ہے۔ 'بنیاد' وہی بنیادی قدر اور حقیقی نصب العین ہے جو وحیِ ہدایت اور وحیِ فطرت سے میسر آتا ہے۔ بلکہ صاف کہنا چاہیے کہ بنیاد خود وحی ہے۔

شبِ تار حیات: یعنی انسانی زندگی کی اندھیری رات جو اس لیے روشن نہیں ہو رہی کہ انسان کا فکر و عمل ہدایت اور فطرت یعنی وحی سے غیر متعلق ہو گیا ہے۔

خوب و ناخوب: اچھا اور بُرا جس کا تعین خیر و شر کی ان مستقل اقدار سے ہوتا ہے جو عقل کی تخلیق نہیں ہوسکتیں بلکہ اُن کی 'بنیاد' اصولِ ہدایت اور قانون فطرت کے نقطۂ یکجائی پر ہوتی ہے۔ یہاں خوب و ناخوب کا دائرہ اخلاقیات سے لے کر جمالیات تک پھیلا ہوا ہے۔ یعنی خیر کا قیام حسن کے بغیر ممکن نہیں ہے اور حُسن کی تشکیل خیر کو منہا کر کے نہیں ہوسکتی۔ اور خیر ہو یا حسن، دونوں حق پر اور حق سے قائم ہیں۔ جو امر اس قیام کو ممکن بناتا ہے وہ یہی وحی ہے۔

حیات: وحی جو ہدایت اور فطرت دونوں کا ماخذ ہے۔

اسرارِ حیات: انسان اور کائنات کے حقائق، انفس و آفاق کے بھید، نظامِ ہستی کے اصول۔

آخری مصرعے میں 'حیات' کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک 'حیات' ہدایت یا وحی ہدایت ہے، اور دوسری فطرت یا وحیِ فطرت۔ دونوں ادغام کے درجے کو پہنچی ہوئی ہم آہنگی رکھتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حقائق کا اظہار ہیں اور ایک کا اجمال دوسرے میں تفصیل کے ساتھ ظاہر ہے۔

❁❁❁

استفسار:

شعر و ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میں جب اقبال کی شاعری پڑھتا ہوں تو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ شاعر اقبال پر ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔ ہم نے ان کی شاعرانہ عظمت کو الگ سے خاطر خواہ اہمیت نہیں دی بلکہ شاعری کو اُن کے نظریات کا خوبصورت بیان سمجھ لیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہم اقبال کی مقصدیت کو پوری اہمیت دینے کے باوجود اُن کی شاعری کو اس کا تابع نہ بنائیں۔ کچھ لوگوں نے ایسا کیا ہے لیکن اُن کی آواز ابھی اتنی بلند نہیں ہے کہ مقصدیت پسندی کے شور پر غالب آجائے۔

اس پس منظر میں آپ سے درخواست ہے کہ میری اس معاملے میں رہ نمائی فرما دیں کہ اقبال کی بہترین اردو نظمیں کون سی ہیں اور اُن کی بنیادی خوبیاں کیا ہیں؟ آپ کے جواب سے مجھے اپنے ایک منصوبے کی تکمیل میں مدد ملے گی۔ شکریہ

[ارشاد المجیب]

جواب:

اقبال کی بہترین نظموں کا انتخاب آسان نہیں ہے۔ شاعری میں انتخاب کے کئی زاویے ہوتے ہیں۔ اور عین ممکن ہے کہ ایک پہلو سے جو نظم بہترین کہلانے کی مستحق ہو، دوسرے رُخ سے اُس کی حیثیت معمولی ہو۔ مثال کے طور پر ''خضرِ راہ''، ''طلوعِ اسلام''، ''شمع اور شاعر''، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' وغیرہ موضوعاتی یا

مقصدی شاعری کے شہ پارے ہیں، لیکن خالص شاعری کی روایت میں انھیں اتنے اونچے درجے پر نہیں رکھا جائے گا۔ اس مشکل کا سرِ دست ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے کہ اقبال کی ایسی نظمیں منتخب کی جائیں جو ہر زاویۂ انتخاب سے بہترین قرار دی جاسکیں۔ اس صورت میں منتخب نظموں کی تعداد تو کم ہو جائے گی لیکن یہ اطمینان ضرور رہے گا کہ ان نظموں میں اقبال کے شعری جوہر کی تقریباً تمام جہتیں مجتمع ہو کر اپنی بہترین حالت میں ظاہر ہوئی ہیں۔

میرے خیال میں ''مسجد قرطبہ''، ''ذوق و شوق''، ''لالۂ صحرا''، ''ساقی نامہ'' اور ''جبریل و ابلیس'' اقبال کی بہترین نظمیں ہیں۔

شاعری کے تمام اصناف میں کچھ باتیں مُشترک ہوتی ہیں اور کچھ انفرادی۔ ایک ایک نظم کا جائزہ لینا تو فی الوقت ممکن نہیں ہے، ان کی مجموعی خوبیوں کی طرف اشارہ کر دینا بھی امید ہے کہ کافی ہوگا۔ ان نظموں کے مشترکہ اوصاف یہ ہیں:

اظہار کی دونوں بنیادیں یعنی آواز اور تمثال، آخری حد تک مکمل ہیں اور ایک دوسرے سے اتنی برابری کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں کہ معانی کی تشکیل میں ذہن کو کوئی ضروری عنصر باہر سے نہیں لانا پڑتا۔ ان سب لفظوں میں ایک صوتی اور تصویری نظام اس طرح کارفرما ہے کہ لفظ اور معنی کے درمیان نئی نئی نسبتیں پیدا ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان نظموں میں شرافتِ معنی (Nobility of the content) اپنے منتہا پر نظر آتی ہے۔ ان کے موضوعات بھی ایسے ہیں کہ معمولی تخیل اُن کی طرف رُخ نہیں کر سکتا، اور مضامین کی بلندی بھی ایسی ہے کہ عام ذہن اور طرزِ احساس کی رسائی سے بالکل باہر ہے۔ اور پھر ان نظموں میں جن تصورات کو کمالِ اظہار دیا گیا ہے، وہ محض شاعرانہ نہیں ہیں بلکہ انسان کے مجموعی شعور کے مرکز سے پھوٹے ہیں۔ ہر تصور مابعدالطبیعی بناوٹ رکھنے کے ساتھ ساتھ تخیل، تفکر اور تعقل کی بہترین روایات سے بھی اعلیٰ درجے کی مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان نظموں میں تقدیری شکوہ رکھنے والے ان تصورات کو جس طرح محسوسات میں بدلا گیا ہے وہ ایک جمالیاتی کارنامہ ہے جو بڑا شاعر ہی انجام دے سکتا ہے۔ یہ کارنامہ بتاتا ہے کہ بڑی شاعری، بڑے تصورات کی تشکیل اور تکمیل میں اُن حدود کو توڑ دیتی ہے جو عقلی علوم کی رسائی کا دائرہ بنانے کے لیے عمل میں آتے ہیں۔ بڑا شاعر عقل کے بعض ایسے مطالبات پورے کر دیتا ہے جن کی تکمیل سے خود عقل عاجز ہے۔ مثال کے طور پر ''مسجد قرطبہ'' میں وجود اور وقت کے مختلف مراتب کو جوڑ کر جو ہیئتِ وحدانی بنائی گئی ہے، وہ عقلی شعور کی سیرابی کا بھی سامان رکھتی ہے۔ اسی طرح ''لالۂ صحرا'' میں کائناتی وجود کی جس جدلیاتی وحدت کو انسان میں برسرِ کار دکھایا گیا ہے، اُس کی طرف فلسفیانہ پیش قدمی تو بہت ہوئی ہے مگر اس نظم کی پہنچ کہیں آگے تک ہے۔ ''جبریل و ابلیس'' کی بھی

یہی شان ہے۔ اس میں خیر و شر کو کائناتِ ہستی کے قطبین کی حیثیت سے جس طرح دو منتہائی کرداروں میں ڈھال کر متصادم کروایا گیا ہے، اُس کے نتیجے میں اصولِ وجود کا ساکن مابعد الطبعی سٹرکچر ہل کر رہ گیا ہے اور یہ جاننے کا راستا کھل گیا کہ شر نہ ہوتا تو حقیقتِ وجود فعال نہ ہوتی۔ فلسفیانہ معیار سے بھی یہ ایک گہری معرفت ہے جس کی گہرائی عام عقل کی استعدادِ غوّاصی سے زیادہ ہے۔

آپ ذرا سا غور کر لیں تو یہ بات خاصی حد تک واضح ہو جائے گی کہ یہ نظمیں بڑی شاعری کے قریب قریب تمام ہی معیارات پر پوری اترتی ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ معیارات اپنی طرف سے قائم بھی کرتی ہیں۔

❁❁❁